اشارات

گذشتہ سال قدس شریف میں موتمر اسلامی کا جو اجتماع ہوا تھا، اس کی تجاویز میں سب سے بہتر اور مبارک تجویز یہ تھی کہ اسلام کے قبلۂ اول میں تمام مسلمانان عالم کے لئے ایک جامعۂ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی) قائم کی جائے۔ اس تجویز کو عموماً پسند کیا گیا اور مصر و فلسطین میں اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک حرکت شروع ہو گئی تا اب کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیمگاہ کے لئے ایک بڑی عمارت اور اس کے مصارف کیلئے ۱۰ ہزار پونڈ سالانہ کے اوقاف مل گئے ہیں لیکن ابھی کام شروع کرنیکے لئے مزید ۱۰۰۰۰ پونڈ کا انتظام ہونا ضروری ہے چنانچہ اس غرض کے لئے فلسطین کے مفتی اعظم مولنا الحاج امین الحسینی اور مصر کے سابق وزیر محمد علی پاشا علوبہ آجکل ہندوستان آئے ہوئے ہیں، اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس جامعۂ اسلامیہ میں تعلیم کا انتظام جس نہج پر ہوگا اس کی تفصیلات ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئیں لیکن معززوافدین نے اس کا جو مختصر خاکہ اپنے بیانات میں پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردست جامعہ کے چار شعبے ہوں گے دینیات، طب، زراعت اور صنعت و حرفت۔

اگرچہ جامعہ مذکور کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی تفصیلات کا مطالعہ کئے بغیر محض اس مختصر بیان پر کوئی رائے ظاہر کرنا قبل از وقت ہوگا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ان تفصیلات کے متعین ہونے سے پہلے چند باتیں اصول کے طور پر جامعۂ اسلامیہ کے موسسین و ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کریں۔

جہانتک مسلمانان فلسطین کی مقامی ضروریات کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے نہ صرف ان شعبوں کا قائم

ہونا ضروری ہے جن کا ذکر معزز وافدین نے کیا ہے، بلکہ فنونِ ہندسہ، حقوق، اور اگر ممکن ہو تو فنِ حرب کے شعبے بھی قائم کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن اس حیثیت سے اس جامعہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ ہوگی جس کی بنا پر وہ جامعۂ اسلامیہ کہی جا سکے، اور تمام عالمِ اسلامی کے لئے ایک علمی و فکری مرکز بن سکے۔ اسی طرح اگر اس میں شعبۂ دینیات کی حیثیت بھی وہی ہو جیسی قاہرہ، حیدرآباد، دہلی اور علیگڈھ کی یونیورسٹیوں میں ہے تب بھی یہ اس مقصد کو پورا نہ کر سکے گی جس کی خاطر دنیائے اسلام کے لیے ایک مرکزی جامعۂ اسلامیہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اور یہی کیفیت اس صورت میں بھی ہوگی کہ اس مجوزہ یونیورسٹی کا شعبۂ دینیات عالمِ اسلامی میں دیوبند اور ازہر کی طرح کے ایک اور معہد علمی اسلامی کا اضافہ کر دے۔ دراصل عالمِ اسلامی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک ایسی جامعہ ہے جو علومِ اسلامیہ میں نئے سرے سے زندگی کی روح پھونک دے، سات صدیوں سے ان پر جمود اور خمود کی جو کیفیت طاری ہے اس کو دور کرے، ان میں حرکت اور نمو کی قوت پیدا کرے، اور ان کے نظام میں ایسی جان ڈال دے کہ جو لوگ ان کو پڑھ کر نکلیں وہ جامد اور محض مقلد نہ ہوں بلکہ اصحابِ فکر و اجتہاد ہوں، اور علمائے متاخرین کی طرح محض درس و افتا کے مسند نشین نہ ہوں، بلکہ فکر و عمل کے میدان میں مسلمانوں کے قائد و رہنما بن سکیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جتنی یونیورسٹیاں دنیا میں قائم ہیں وہ سب بلاشبہ اپنے اپنے میدان میں کچھ نہ کچھ مفید کام کر رہی ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی اصلی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو ان میں مغربی یونیورسٹیوں کی ہو بہو نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بنا پر وہ اس تخیل، اس روح، اس قوتِ محرکہ اور اس ذہنیت سے خالی ہیں جو خالص اسلامی ہو، یا پھر وہ صدیوں پہلے کے اسلامی مدارس کے آثارِ باقیہ ہیں جن میں اسلامیت اس معنی میں تو ضرور ہے کہ ان کا ڈھانچا اسلامی طرز کا ہے، مگر وہ فکر و عمل کی روح سے خالی محض ایک بے جان ڈھانچہ ہے۔ پہلی قسم کی یونیورسٹیاں اس ٹکسال کی طرح ہیں جو دوسری ٹکسالوں کے سکے بناتی ہے۔ اور دوسری قسم کی یونیورسٹیاں اس ٹکسال کے مانند ہیں جو سکے تو اپنے ہی بناتی ہے، مگر ان کا چلن دنیا میں نہیں ہے۔ ہماری ضرورت ان دونوں ٹکسالوں سے پوری نہیں ہوتی کیونکہ ہمیں ضرورت ایسی ٹکسال کی ہے جو سکے بھی اپنے بنائے اور دنیا میں ان کا چلن بھی ہو۔ یہی مسئلہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے گذشتہ نصف صدی

سے مسلمانوں کے ارباب فکر کوشش کر رہے ہیں غور کیا جا رہا ہے کہ تعلیم کے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر کوئی ایسا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کا ڈھانچہ بھی اسلامی ہو اور روح بھی اسلامی اور پھر اس کے ساتھ ہی اس میں وہ قوت محرکہ بھی ہو جو وقت کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے کچھ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس سوال کا حل علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ کے ایک معتدل امتزاج میں ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے یہ رائے قائم کی کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کو علوم جدیدہ کے طرز پر ڈھالا جائے۔ ان مختلف خیالات کے تحت اب تک مختلف تعلیمی تجربے ہو چکے ہیں اور ان سے نسبتہً بہتر نتائج بھی حاصل ہوئے ہیں لیکن اصلی مقصد جس کے لئے یہ تمام کوششیں کی جا رہی ہیں ابتک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

جہاں تک علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ کی آمیزش کا تعلق ہے اس کے مفید اور ضروری ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر ہمارے نزدیک صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کے طرز میں بنیادی تغیر کیا جائے اور اس سے پوری مشین کی ترتیب ہی کو بدل دیا جائے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم جدید طرز پر ہو جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے بلکہ ہمارا مقصد اس کے بالکل برعکس ہے ہم چاہتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کو جس ڈھنگ پر متاخرین نے ڈال دیا ہے اس کو چھوڑ کر وہ ڈھنگ اختیار کیا جائے جو اسلام کی ابتدائی چار صدیوں میں رائج تھا اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آج اس چودھویں صدی میں ہم وہ طریق تعلیم اختیار کرنا چاہتے ہیں جو دوسری اور تیسری صدی کے مناسب حال تھا بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ہمیں اسلامی علوم کی تعلیم کا وہ اصول اختیار کرنا چاہئے جس سے مجتہد پیدا ہوتے تھے اور وہ اصول ترک کر دینا چاہئے جس سے بعد میں مقلد پیدا ہونے لگے۔

یہ اصول کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اس کا بیان یہ ہے کہ ہمارے پورے نظام تعلیم کا مرکز اور مدار قرآن مجید ہونا چاہئے درس و تدریس کی اصلی غرض یہ ہو کہ ہمیں قرآن مجید کو سمجھنا ہے اس کے معانی و مطالب تک رسائی حاصل کرنی ہے اس کے معارف و حقائق میں بصیرت پیدا کرنی ہے اس کو اپنے افکار اور اپنے تخیلات کا حقیقی رہنما بنانا ہے اور

اپنی زندگی اس کے سانچے میں ڈھالنی ہے۔ عربی صرف ونحو، لغت و ادب، معانی و بیان کی تعلیم اسلئے ہو کہ کلام الٰہی کی عبارتوں کو سمجھا جائے۔ سیرت رسول، احادیث و آثار صحابہ و تابعین اور بزرگان اہل بیت کی سیرتوں اور ان کے اقوال کا تفحص اس لئے کیا جائے کہ رسول اکرم اور آپ کے پیچھے متبعین نے قرآن کو کس طرح سمجھا، کس طرح سمجھایا اور اپنی عملی زندگی میں اس کو کس طرح برتا۔ فقہاء کے کلام اور ان کے اجتہادات میں اس نقطۂ نظر سے غور و خوض کیا جائے کہ ان سے وہ طریقے معلوم کئے جائیں جن پر عمل کر کے مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس کرنے والوں نے مسائل کا استنباط کیا اور اصول سے فروع نکالے۔ مفسرین کی تقریروں اور متکلمین کی تاویلوں کا مطالعہ اس غرض سے کیا جائے کہ ان سے وہ تمام پہلو نظر میں آجائیں جو مختلف خیالات رکھنے والے اہل علم و تحقیق نے کتاب و سنت کی تعبیر میں اختیار کئے ہیں۔ سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، قانون اور علوم عمرانی کا مطالعہ اس غرض سے کیا جائے کہ ہم اپنی زندگی کے مسائل میں کتاب و سنت کے مقرر کئے ہوئے اصول پر عمل کرنے کے صحیح طریقے متعین کر سکیں، اور اسلامی نظام تمدن کو ایک ایسا نظام بنا سکیں جو ساکن و جامد نہ ہو، بلکہ وقت اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا رہے۔ فلسفہ و منطق اور علوم عقلیہ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ افکار بشری میں انقلاب پیدا ہو اور اسلامی فکر اور اسلامی تخیل دماغوں پر حکمران ہو جائے۔ غرض ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم ایک ایسا نظام تعلیم قائم کریں جس میں قرآن کی حیثیت ایک محور کی ہو اور یہ پورا نظام اسی محور پر گردش کرے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے اسلامی تمدن نہ صرف زندہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کو دنیا کا غالب تمدن بنایا جا سکتا ہے۔

گذشتہ مہینے سے نواب بہادر یار جنگ بہادر نے ایک عمدہ تحریک شروع کی ہے جس کا چرچا حیدرآباد میں آہستہ آہستہ شروع ہو گیا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حلقۂ اثر میں قرآن مجید کی تعلیمات کو اشاعت دینے کی کوشش کرے اور نہ صرف خود اپنے اوقات کا ایک حصہ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ قرآن مجید کو سمجھنے میں صرف کرے، بلکہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بھی اس طرف توجہ دلائے نیز جن لوگوں کو وہ خود پڑھا سکتا ہو انھیں پڑھائے بھی۔ چاہے وہ

روزانہ ایک ہی آیت ہو۔ یہ دراصل وہی تحریک ہے جو قرن اول کے مسلمانوں میں رائج تھی، ہجرت کے بعد پہلی سال کے اندر اسلام جو آندھی اور طوفان کی طرح دنیا کے اطراف واکناف میں پھیل گیا اس کے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہر مسلمان اپنی دوسری حیثیات کیساتھ ایک مستقل حیثیت مبلغ اور معلم ہونے کی بھی رکھتا تھا۔ قرآن کی تعلیم اس وقت مسجد کے ملا اور مکتب کے استاد جی کیلئے مخصوص نہ تھی اور نہ اسلام کی تبلیغ کیلئے واعظوں اور مبلغوں کا کوئی الگ پیشہ بنا تھا بلکہ مسلمان جہاں اور جس حیثیت میں بھی تھا معلم قرآن اور مبلغ اسلام تھا۔ ضرورت ہے کہ اسی طریقے کو اب بھی اختیار کیا جائے اور ہر شخص فرداً فرداً کلام الٰہی کے پھیلانے کی کوشش کرے۔ کیا ہم امید کریں کہ دوسرے مقامات کے مسلمان بھی اس تحریک کو اشاعت دیں گے؟

مغرب کے نظام تمدن کو جو شدید امراض اس وقت لاحق ہیں ان میں سے ایک بڑا مرض عورتوں کا معاشی استقلال ہے۔ اہل مغرب نے غلطی سے عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات پیدا کرنے کے معنی یہ سمجھے کہ جو کام مرد کریں وہی عورتیں بھی کریں۔ گذشتہ جنگ عظیم کی غیر معمولی ضروریات نے اس غلط نظریہ کو عملی صورت دیدی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام عورتوں سے متعلق تھے ان کو چھوڑ کر وہ کارخانوں، بازاروں اور دفتروں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگیں۔ یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک اس وقت عائلی زندگی کی بربادی، ازدواجی مسرتوں کے فقدان، مناکحت کی طرف رجحان کی کمی، معیار اخلاق کی پستی، امراض خبیثہ کی خوفناک ترقی، شرح پیدائش کے روز افزوں تنزل اور محنت پیشہ طبقوں کی بڑھتی ہوئی بیکاری کے جن گوناگوں خطرات میں مبتلا ہیں، ان کی براہ راست ذمہ داری عورتوں کے اسی معاشی استقلال پر عائد ہوتی ہے۔

بظاہر اس معاشی استقلال میں جو محاسن ہیں ان کو دیکھ کر اہل مشرق بھی مغرب کی تقلید کرنا چاہتے ہیں مگر شاید ان کو معلوم نہیں کہ مغرب کے عاقبت اندیش مدبر خود اس غلط نظام کی خرابیاں محسوس کر کے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں اٹلی کے فرمانروا مسولینی نے جو کچھ کیا ہے وہ مشہور ہے۔ اب دوسری مثال جرمنی کے نئے چانسلر نے پیش کی ہے۔ جرمنی کی تعمیر جدید کے لئے وہ جن تدابیر کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے ان میں سے

ایک یہ ہو کہ عورتوں کو ان کے فطری حدود عمل میں واپس کیا جائے چنانچہ حال میں جو قانون اس نے نافذ کیا ہے اس کی رو سے تمام غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں پر ایک ٹیکس عائد کیا جائے گا اور اس ٹیکس سے جو رقم جمع ہوگی اس سے ان لوگوں کو ضروریات خانہ داری مہیا کرنے میں مدد دی جائے گی جو شادی کرلیں گے، بشرطیکہ عورت یہ عہد کرے کہ جب تک اس کا شوہر کم از کم ۲۵ مارک ماہوار کماتا رہیگا اس وقت تک وہ کوئی ملازمت قبول نہ کریگی۔

امریکہ کی دولت مندی و خوشحالی پر دنیا میں رشک کیا جاتا ہے مگر خود اس ملک کے باشندے اپنے غلط نظام تمدن کی بدولت جن مشکلات میں مبتلا ہیں ان کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کے اس سب سے زیادہ دولت مند ملک میں خودکشی کی رفتار تمام ممالک سے زیادہ بڑھ رہی ہے ۱۹۳۱ء میں وہاں (۲۰۰۸۸) آدمیوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا ۱۹۳۲ء میں یہ تعداد (۲۳۰۰۰) تک پہنچ گئی گویا ایک سال میں تقریباً ۳ ہزار خودکشیوں کا اضافہ ہوا اس کے قریب قریب انگلستان کا حال بھی ہے جہاں ۱۹۱۱-۲۰ء میں خودکشی کا اوسط ۸۰ فی ملین تھا ۱۹۲۵ء میں ۱۰۵ ہوا، اور ۱۹۳۰ء میں ۱۲۷ تک پہنچ گیا۔ ظاہر ہے کہ انسان اپنی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ اسی حالت میں کرتا ہے جب اس کے لئے زندگی کے آلام ناقابل برداشت ہوجاتے ہیں اور اس حالت میں بھی صرف وہی لوگ ایسا کرتے ہیں جن میں قوت تحمل کم ہوتی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی زندگی کے آلام کتنی کثیر آبادی کو پریشانیوں میں مبتلا کئے ہوئے ہوں گے جن میں سے چند ہزار آدمی ہر سال اپنے آپ کو خود ہلاک کر دینے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں یہ نتائج ہیں اس نظام تمدن کے جسے اختیار کرنے کے لئے ہماری قوم کے ارباب تجدد بیچین ہیں مگر کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اسلامی تمدن کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی، کبھی اسلامی ممالک میں انسان پر عرصۂ حیات اتنا تنگ ہوا تھا کہ وہ دنیا سے بھاگ کر اس طرح موت کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا؟ کیا اسلامی تاریخ کے کسی دور میں خودکشیوں کی اتنی کثرت یا اس سے کم کسی قابل لحاظ تعداد کا پتہ دیا جا سکتا ہے؟